ڈاکٹر ارتضیٰ حسن کاظمی*

بدلتی دنیا کے تقاضے اور فکرِ اقبال

Iqbal's Thought and the Demands of a Changing World

Abstract: *Fragile human beings, created like glass, cannot withstand the trials of time. Moreover, the ever-changing ideologies of the modern era have made it difficult for humans to determine their true destination. Only a message that unveils the principles of stability and permanence in a changing world can be truly effective. Iqbal emerges as a sage who successfully transforms his philosophical insight into a dynamic movement, addressing the challenges of a changing world and guiding humanity towards a clear and purposeful direction.*

The first expression of Iqbal's creative intellect appeared in his book on economics, where he emphasized the significance of economic freedom, believing that the economy determines the inner and outer strength of a nation's individuals. Iqbal also valued both individual and collective Ijtehad (independent reasoning) as an intellectual response to the evolving manifestations of civilization. According to Iqbal, nature and history are the greatest teachers, continuously reshaping the world from new perspectives and creating novel patterns of thought and action. He firmly believed that the foremost demand of the modern age is the preservation of Islamic identity, as nations deprived of faith and spiritual values have failed to offer practical models of human unity, justice, and dignity .

Keywords: *Iqbal, Islamic identity, Ijtehad, economic freedom, spirituality, philosophy of change, modern civilization, human unity, permanence and stability.*

تلخیص: باعتبارِ تخلیق، شیشے کی طرح کمزور انسان حادثاتِ زمانہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے اس پر مستزاد یہ کہ خرد کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے نظریات نے انسان کے لیے منزل کے تعین کو دشوار بنا دیا ہے۔ وہی پیغام بدلتی ہوئی دنیا میں معتبر ہو سکتا ہے جو مملکتِ صبح و شام میں استحکام اور دوام کے رموز سے پردہ اُٹھائے اور خود سیل بن کر سیل زمانہ کو تھام لے۔ اقبالؔ ہی ایک ایسا دانائے راز ہے جو اپنی بصیرت و بصارت کو ایک تحریک کی صورت دینے میں کامیاب نظر آتا ہے اور بدلتی دنیا کے تقاضوں کو اپنی فکر کے دائرے میں لا کر ہمارے لیے باقاعدہ ایک سَمت کا تعین کرتا ہے۔ اس ضمن میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا پہلا اظہار اقبالؔ نے اقتصاد کے موضوع پر لکھی گئی کتاب سے کیا جس میں اُنھوں نے معاشی آزادی کو اہم قرار دیا کیونکہ اقبالؔ کے بقول معیشت ہی قوم کے افراد کے باطنی اور ظاہری قویٰ کو چپکے چپکے اپنے سانچے میں ڈھالتی ہے۔ اس کے علاوہ تمدنی مظاہر میں تبدیلی کے پیشِ نظر انفرادی اجتہاد کے ساتھ ساتھ اجتماعی اجتہاد کو اپنانے کی اہمیت کا موضوع بھی اقبالؔ کو ہمیشہ محبوب رہا۔ فطرت اور تاریخ کو اقبالؔ کے ہاں بہترین معلم کی حیثیت حاصل ہے جو مسلسل ضربت سے دنیا کو نئے زاویوں سے تراشتی ہے اور نئے نئے نقش اُبھارتی ہے۔ ان تمام عوامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اقبالؔ کے مطابق اس بدلتی دنیا کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی تشخص کو برقرار رکھا جائے کیونکہ ایمانی اور روحانی اقدار سے نابلد اقوام احترامِ آدمیت اور انسانی وحدت کا کوئی عملی نمونہ پیش کرنے سے قاصر رہی ہیں۔

کلیدی الفاظ: اقبال، اسلامی تشخص، اجتہاد، اقتصادی آزادی، روحانیت، تغیر کا فلسفہ، جدید تہذیب، انسانی وحدت، ثبات و دوام۔

*** صدر شعبہ اردو، ایف ایف سی اسکول اینڈ کالج، میرپور ماتھیلو، سندھ۔**

ذاتی اثبات کے متلاشی انسان کو آج کی دنیا میں اس بات کا شدت سے احساس ہوتا جا رہا ہے کہ اس کی مجبوری اور مقہوری میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ماضی بعید میں رونما ہونے والی عالمگیر جنگیں، ماضی قریب میں بوسنیا اور سری لنکا سمیت متعدد ممالک میں غارت گری اور موجودہ دور میں کشمیر، شام، فلسطین، افغانستان وغیرہ میں جاری مقامی جنگیں انسان کو اس کی بے وقعتی اور بے حیثیتی کا بار بار احساس دلاتی ہیں۔ ایک ٹوٹی ہوئی شکستہ حال دنیا جس میں فوجیوں کی لاشیں اور پناہ گزینوں کی فریادیں اور اُجڑے خاندان نظر آتے ہیں، اُسے کیسے سکون میسر آسکتا ہے۔ بقول فیضؔ۔

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آ لگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے
اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے(۱)

مزید براں اندیشۂ فردا ایسا کہ ہر شخص اپنے آنے والے کل سے خوف زدہ ہے۔ صنعتی دور نے تو فرد اور معاشرے کے تعلق کو کاروبار بنا دیا ہے۔ اس غیر فطری ماحول میں شخصی روابط تیزی سے معدوم ہو رہے ہیں۔ ”بیسویں صدی کے تہذیبی مسائل، سائنس اور ٹیکنالوجی“ کے حوالے سے شمیم حنفی اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ”اس منزل پر افراد کے درمیان انحصارِ باہمی ایک ایسی مجبوری بن جاتا ہے جسے ہر فرد جذباتی طور پر قبول کرنے میں دشواری محسوس کرتا ہے اور اسے یوں نظر آتا ہے کہ یہ رشتے افراد کے درمیان نہیں بلکہ بے جان اشیاء کے درمیان قائم ہیں: ایک میکانکی اور مصنوعی لیکن ناگزیر سطح پر۔ اس رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے ہر فرد اپنے چہرے پر جھوٹے مقنعے چڑھا لیتا ہے۔ دنیا اُسے جس شکل میں دیکھتی ہے وہ اس کا حقیقی چہرہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک حاجت مند اور حاجت روا شے کا چہرہ ہوتا ہے۔“(۲)

جس طرح انگارہ اپنے وجود میں حرارت اور توانائی تو رکھتا ہے مگر اس کا وجود انتہائی عارضی ہے بالکل اسی طرح انسان بھی بے پناہ صلاحتیں رکھنے کے باوجود بہت مختصر سرمایۂ حیات کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ موجودہ سائنسی تحقیق کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ انسان کا نازک وجود بذاتِ خود ایک معجزہ ہے۔

خالقِ کائنات تو اس امر کی وضاحت پہلے ہی کر چکا تھا کہ اس نے انسان کو نازک پیدا کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ آخر کیونکر زندگی کے گونجتے، بجتے، گرجتے مسائل کا احاطہ کر پائے گا؟ یہ صورت اس وقت مذید تشویش ناک ہوگئی جب حضرتِ انسان میں

اثباتِ حیات کی بجائے منفی رجحانات کے پھیلاؤ کا سلسلہ بھی زور پکڑتا چلا گیا۔ یعنی اس مختصر زندگی میں وہ دوسروں کے عرصۂ حیات کو تنگ کرنے کی تگ ودو میں لگ گیا۔ مثلاً جب ڈارون نے علم اور تحقیق کے بل پر حیاتیاتی ارتقاء سے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا تو اسکے اثرات سائنس سے زیادہ انسان کی سماجی زندگی پر پڑے۔

> "جرمن یونیورسٹیوں اور کالجوں میں، جرمن اخباروں میں، جرمن عوام میں مسلسل صرف یہی پروپیگنڈا ہوتا رہا کہ جرمن دنیا کی اعلیٰ ترین نسل ہیں اور یہ اعلیٰ ترین نسل محض حکومت کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔"(۳)

پنڈت سریندر نرائن کا یہ تجزیہ جنگ عظیم دوم کے حوالے سے تھا۔ ہنِ انسانی کی ایک اور جست قانونِ اضافت کا نظریہ تھا جس کا بانی ۱۹۲۲ء میں جاپان کے خیر سگالی دورے پر گیا اور وہاں کے عوام سے باہم شیر وشکر ہو گیا۔ المیہ دیکھیئے کہ آئن سٹائن کے نظریات کی روشنی میں حاصل کی گئی جوہری توانائی ایٹم بم کی صورت اختیار کر گئی اور جاپان کے انہیں شہریوں پر قیامت بن کے اُتری۔ اس حوالے سے مجاہد کامران کی یہ رائے اہم ہے:

> Einstein died with his unforgiving rage in his heart and soul, a rage that will trouble the Germans as long as Einstein's name lives(۴)

اس بدلتی دنیا میں نئے نئے نظریات جنم لیتے رہیں گے اور سائنسی تحقیقات ہوتی رہیں گی مگر ان کے نتائج حوصلہ افزا نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کو درست سمت دی جائے کیونکہ انسان کا مستقبل اِسی سے وابستہ ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ بقول اقبالؔ۔

ہے راکبِ تقدیر جہاں تیری رِضا دیکھ (۵)

فکرِ اقبال

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اگر اقبالؔ نہ ہوتے تو اُردو ادب کا سرمایا اور حلقہ اثر محدود ہوتا کیونکہ اقبالؔ سے قبل شعراء ادب کو اپنے زمانے سے پیوستہ اور ہم رشتہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے یا یوں کہہ لیجیے کہ مادی اور سماجی مسائل کو ذہنوں میں اُتارنے کا کام سرانجام نہ دے سکے۔ لکھنوی شاعروں کو معاملہ بندی سے فرصت نہ تھی اور دِلی کے شعراء پر نکتہ آفرینی کا جنون سوار تھا۔ غالبؔ کو لاکھ بزلہ سنج اور حیوان ظریف کہا جائے مگر غالبؔ جیسے شاعر نے یہ کہہ کر کہ۔

نغمہ ہائے دل غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہوجائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن (۶)

زندگی کو کوئی حوصلہ افزا پیغام نہیں دیا۔ اس کے برعکس اقبالؔ نے یہ کہہ کر کہ۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام (۷)

حیات بخش رجائیت کا چراغ روشن کیا۔ بلاشبہ اقبالؔ ہی ایک ایسا مرد خود آگاہ اور دانائے راز ہے جو اپنی بصیرت اور بصارت کو ایک سَمت دینے میں کامیاب نظر آتا ہے اور بدلتی دنیا کے تقاضوں کو اپنی فکر کے دائرے میں لا کر عالم انسانی کے لیے باقاعدہ ایک سمت کا تعین کرتا ہے۔ اقبالؔ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ زمانے میں رونما ہونے والے تغیرات کی ایک ایسی جیتی جاگتی اور اثر انگیز تصویر کشی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو ذہن انسانی میں ایک حرکت، ایک ارتعاش پیدا کرتی ہے:

رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بینکوں کی عمارات (۸)

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات (۹)

برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو مایوسی کی فضا سے رہائی دِلوانے کے لیے اقبالؔ نے تاریخی حوالوں سے مدد لی۔ اقبالؔ نے قوموں کے عروج و زوال کی روشنی میں یہ منطقی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قوموں کی زندگی بے اعتبار و ناپائیدار ہوتی ہے اور بہت جلد تاریخ کے صفحات کی زینت بن جایا کرتی ہے۔ وہ فِرنگ کی نام نہاد ترقی سے مرعوب نہیں ہوتے کیونکہ انہیں یقین ہے کہ اس زیاں خانے میں کسی کو ثبات حاصل نہیں ہے۔ ان کے مطابق یہ جہان قوموں کی بربادی دیکھے کا اس قدر عادی ہے کہ اب اسے کسی کی کوئی فکر نہیں۔ سینکڑوں اقوام اس رہ گزر سے رخصت ہو چکی ہیں اور زندگی کی ڈگر ہزاروں قافلوں سے آشنا ہے۔ جس طرح کوہِ نور کا ہیرا مختلف بادشاہوں کے سر کے تاج میں رہا اور کوہِ نور نے یہ منظر کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ کیسے کیسے شہنشاہ خاک میں مل گئے۔ مزید یہ کہ مختلف تہذیبوں کے نشانات مٹ گئے اور ان کے بادشاہ آج گورستانِ شاہی میں محوِ خواب ہیں۔ وہ مصر کی تہذیب ہو یا بابل کی، اس دفترِ ہستی میں اپنا وجود کھو چکی ہیں۔ یونان اور روما کی عظمت کو گردشِ شام و سحر نے پامال کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ اجل کی شام نے بڑی بڑی سلطنتوں کے آفتاب گُل کر دیے ہیں۔ اقبال کا ان حقائق سے پردہ اُٹھانے کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان اِس بے یقینی کی کیفیت سے نجات حاصل کریں اور اس بات کا یقین کرلیں کہ فطرت کو ایک صورت سے قرار نصیب نہیں ہوتا بلکہ اس کا ذوقِ جدت نئی نئی صورتیں تراشتا رہتا ہے۔ یہ خدا کی شانِ جلالی ہے

کہ اس نے بڑے بڑے فرعونوں کے دفتر غرقِ مئے ناب کر دیے۔ اقبالؔ کو تشویش یہ لاحق ہے کہ مسلمان بھی کہیں اس فہرست میں شامل نہ ہو جائیں۔

آہ! مسلم بھی زمانے میں یونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابرِ آذاری اُٹھا، برسا، گیا (۱۰)

اقبالؔ کی نظر میں یہی وہ غمِ ملت ہے جو غمِ تازہ کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ تاریخ نے شانِ جلالی کے بہت سے مظہر پیش کیے ہیں اور استحصالی معاشروں کو نیست و نابود کر دیا۔ اقبالؔ کا مقصود یہ ہے کہ مردِ مسلمان تو خدا کے جمال کا آئینہ ہے لہٰذا دوام تو اُس کا مقدر ہونا چاہیے۔ اقبالؔ کی ہمہ گیر شخصیت مسلمانانِ برِ صغیر کے لیے نجات کا سفینہ تھی۔ وہ جہاں اپنوں سے یہ کہہ رہا تھا کہ میں محرمِ رازِ درونِ میخانہ ہوں وہاں یورپ کے فیلسوف کے باہمی اختلافات کا تماشا بھی دیکھ چکا تھا۔ اقبالؔ بیک وقت فلسفی، تاریخ دان، عالمِ دین، محقق، دانائے راز اور مصلحِ قوم تھا۔ اِن صفات کے علاوہ سب سے بڑھ کر جو دولت اس کے ہاتھ آئی وہ شاعری کی خداداد صلاحیت تھی۔ شاعری ایک ماورائی قوت کا استعارہ ہے کیونکہ دنیا کے تمام علوم و فنون کا مقصد اثر انگیزی پیدا کرنا ہے اور شاعری یہ کام براہِ راست کرتی ہے۔ شاعری کا یہی اعجاز ان میں قیادت کی فکر کو پروان چڑھاتا ہے۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
تیرے لیے ہے میرا شعلۂ نوا قندیل (۱۱)

اقتصاد

یہ حقیقت اقبالؔ کے پیشِ نظر ہمیشہ رہی کہ جب تک مسلمان معاشی طور پر آزاد نہیں ہوں گے حقیقی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا پہلا اظہار اقبالؔ نے "اقتصاد" کے موضوع پر لکھی گئی کتاب سے کیا جس میں اُنھوں نے معاشی آزادی کو اہم قرار دیا کیونکہ اقبالؔ کے بقول معیشت ہی قوم کے افراد کے باطنی اور ظاہری قویٰ کو چپکے چپکے اپنے سانچے میں ڈھالتی ہے۔

اس موضوع پر یہ طباع آزمائی اقبالؔ کی کوششوں کا اولین ثمر ہے۔ اس کتاب میں اقبالؔ نے اپنی ذاتی آراء کو مستند مضامین اور کتب کے حوالوں کے ساتھ پیش کیا اور وضاحت پیش کی ہے کہ یہ کتاب کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں۔ اس کا بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ ذوقِ مطالعہ رکھنے والوں کے لیے اقتصادیات جیسے سنجیدہ موضوع پر آزادانہ سوچ بچار کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اقبالؔ یوں تو شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے مگر اب ان کی یہ سنجیدہ کوشش اہلِ علم کی فکر سازی میں بھی اپنا کردار ادا کرنے لگی۔ اقبالؔ نے یہ کتاب (۱۹۰۳ء) اُس وقت تصنیف کی جب اِن کی آنکھوں س نے یورپین معاشرے کا نظارہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہاں کی تہذیب و

تمدن کا غلغلہ ان کے کانوں میں پڑا تھا۔ اس ابتدائی تصنیف کا مقصد یہ بھی تھا کہ عوام معمولی درجے کی (افسانوی) کتب کا مطالعہ چھوڑ کر اِس کتاب کے توسط سے عملی زندگی اور تمدنی حالات پر غور کرنا شروع کر دیں۔ اس بات کے پیشِ نظر اقبالؔ نے اس کتاب کا اُسلوب سادہ اور زباں سلیس رکھی۔ علامہ نے بول چال کے انداز میں یہ باور کروایا کہ غربت ہی اخلاقی گراوٹ کا باعث ہے جو روح کے مصفّا آئینے کو آلودہ کر دیتی ہے۔ غلامی کی بجائے تعلیم اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے انسانی کی تعمیر کرتی ہے۔ اقبالؔ لکھتے ہیں۔

> ”ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے، بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّہ آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ اوّل یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لیے ایک ضروری جزو ہے، مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لیے لازمی جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔“(۱۲)

اس مرحلے پر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ علامہ کا مقصود محض مسائل کو اُچھالنا نہیں رہا بلکہ ان کا شافی حل ان کا مقصودِ اصلی ہے۔ اقبالؔ نے جس تعلیم کو روا رکھنے کا عندیہ دیا وہ تشکیلِ خودی اور تعمیرِ اخلاق کے فرائض سرانجام دینے کی اہل ہونی چاہیے۔

اس پر امجد علی بیگ نے یوں تبصرہ کیا ہے:

> ”لیکن ایک ماہر اقتصادیات کی طرح وہ ہمیشہ حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے کے بعد نہ صرف یہ سوال کرتے ہیں کہ پس چہ باید کرد؟ بلکہ اس مسئلے کا شافی نسخہ بھی تجویز فرماتے ہیں۔ قومی ترقی کے لیے بھی اُنھوں نے تعلیم کا نسخہ کیمیا تجویز فرمایا۔ ایسی تعلیم نہیں جو تیشہ الحاد سے مذہب، اخلاق، حُسنِ عمل اور ذوقِ تجسس کو ضرب کاری لگائے اور شاہین بچوں کو تشکیلِ خودی کے فرائض سے یکسر غافل کر دے بلکہ ایسی تعلیم جو دین اور دنیا دونوں کو سنوارنے میں مدد دے۔“(۱۳)

اس متن کا حوالہ یہاں دینا اس لیے ضروری ہے کہ اُن تمام عوامل کا احاطہ ممکن ہو سکے جو اس کتاب کے لکھنے کا مقصود ہے۔ علامہ کے نزدیک ”اقتصاد“ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اُن حقائق سے آگاہی حاصل کریں جن کا جاننا فی زمانہ ضروری تھا اور ان صداقتوں پر غور کریں جن پر بنی نوع آدم کی حیات کا دارومدار ہے۔ اقبالؔ کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے اُس زمانے میں معیشت کے

حوالے سے تعلیم، تجدیدِ نسل، صرف دولت جیسے اہم موضوعات کو چھیڑا ہے جو آج اس بدلتی دنیا کے اہم ترین موضوعات ہیں۔ جدید تحقیق کی روشنی میں بطورِ خاص تعلیم کی اقتصادی اہمیت پر لاتعداد کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق انسان کے ذہنی افلاس پر خرچ ہونے والی ہر پائی ملکی آمدن میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ آجکل ترقی یافتہ اقوام اپنی آمدن کا چار سے چھ فی صد تعلیم پر خرچ کرتی ہیں جبکہ ہم جیسی پسماندہ اقوام دو فی صد سے آگے نہ بڑھ پائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن ممالک میں اَن پڑھ شخص اتنا ہی نایاب ہے جتنا ہمارے ملک میں پڑھا لکھا شخص۔ ہمارے پڑوسی ملک ایران میں برپا ہونے والے انقلاب کے موقع پر وہاں کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے تعلیم کے ضروری مقاصد پر غور و فکر کر لیا جائے تاکہ درست سمت کا تعین ممکن ہو سکے۔ اس خاطر انہوں نے ایک تعلیمی سال کی قربانی بھی دی کیونکہ وہ اس حقیقت سے آشنا تھے کہ وقت کے زیاں کے علاوہ سفر کے رائیگاں جانے کا افسوس تکلیف دہ بھی ہوتا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ یہ کس قدر ضروری امر ہے کہ جس کی خاطر تعلیمی نظام کو ایک برس کے لیے موقوف کیا گیا۔ صرف یہی نہیں اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں اٹل حقیقتوں کو فراموش نہ کریں۔ انسان با اعتبارِ تخلیق بہت ہی کمزور ہے اور اگر وہ زندگی کی ناقابلِ تردید حقیقتوں کو نظر انداز کرے گا تو زندگی کی تگ و دو میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ غربت اور معاشی زبوں حالی کے شکار کاشتکاروں کی اقتصادی بدحالی اور مقروضیت کے ازالے کی خاطر اقبالؔ مارچ ۱۹۳۲ء میں ایک مہم چلانے کے آرزومند تھے۔ ان کی رائے میں ایک قوم کی ترقی پسند قوتوں کو بیدار کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ ان کے سامنے ایک نیا لائحہ عمل رکھا جائے۔ نئے ثقافتی ادارے کھولے جائیں جن میں مرد و زن کی تمیز روا نہ رکھی جائے۔

اب ہم تعلیم سے متعلق اقبال اقبال کی اہم رائے کا تجزیہ کرتے ہیں۔

> ”زندگی کا شرارہ کسی سے مستعار نہیں لیا جا سکتا، اسے خود اپنی روح کے نہاں خانے میں روشن کرنا ہو گا۔ اس کے لیے پُرخلوص تیاری اور نسبتاً مستقل پروگرام کی ضرورت ہو گی۔“(۱۴)

اقبالؔ کا اشارہ اس تعلیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو وسیع المشرب ہے اور بنی نوعِ انسان سے محبت اور چاہت کے قرینے سکھاتی ہے۔ امراضِ ملت کی دوا ڈھونڈنا مقصود ہے تو تعلیم سے بڑھ کر کوئی دوا نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تعلیم کا نشتر انسانی معاشرے سے فاسد عناصر کا انخلا کر کے اسے مصفا کر دیتا ہے۔ تعلیم سے آراستہ اور محنت کی خوگر اقوام ہی بدلتی دنیا کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہیں۔

اجتہاد

تمدنی مظاہر میں تبدیلی کے پیشِ نظر انفرادی اجتہاد کے ساتھ ساتھ اجتماعی اجتہاد کو اپنانے کی اہمیت کا موضوع بھی اقبالؒ کو ہمیشہ محبوب رہا۔ یہ جرأت مندانہ قدم اُٹھانے کے لیے اقبالؒ نے متعدد مقامات پر ہمارے اسپِ ہمت کو تازیانے لگائے ہیں۔ اسلام کوئی رجعت پسند دین نہیں ہے کہ اس میں جدید سوسائیٹی کے آئین اور موجودہ سائنس کے انکشافات سے مطابقت کی سکت نہ ہو۔ ہر چند کہ اجتہاد کا دروازہ روزِ اوّل ہی سے وا کیا گیا تھا مگر اسے چند پیچیدگیاں پیدا ہونے کے باعث بند کر دیا گیا۔ اقبالؒ کیونکہ حرکی نظریہ کے قائل ہیں اور ان کی نظر ہمیشہ محرکِ زندگی پر رہتی ہے لہٰذا وہ پر ظہور پذیر ہونے والی ایجاد و اختراع کو اپنے تجزیاتی ادراک پر وارد کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر علمائے اسلام کے چار مکاتبِ فکر یہ ہیں: روایتی، فقہی، خانقاہی اور اجتہادی۔ اقبالؒ اجتہادی فکر کے حامل ہیں اور دیگر مکاتبِ فکر کو طنز کا نشانہ بھی بناتے ہیں:

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ (۱۵)

ترے دین وادب سے آرہی ہے بوئے رُہبانی
یہی ہے مرنےوالی اُمتوں کا عالمِ پیری (۱۶)

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلائی و پیری (۱۷)

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رِضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی (۱۸)

اقبالؒ کا اجتہادی اُصول یہ ہے کہ اُنہوں نے مروجہ مکتبِ فکر سے ہٹ کر وحی، فطرت، تاریخ اور عقل کو علم کے بنیادی عقائد میں شمار کیا۔ ان میں سے پہلے تین یعنی وحی، فطرت اور تاریخ حقیقی اور مستقل معیار رکھنے والے علوم ہیں۔ اقبالؒ کے مطابق ماضی کی تمام روایات اور اجتہادات کی صحت کو اِنہیں پر پرکھا جائے۔ اس حوالے سے یوسف گورایہ فکرِ اقبالؒ کی یوں ترجمانی کرتے ہیں:

> "علامہ اقبالؔ بصیرت افروز جدید مسلمہ تصورات اور تازہ حقائق کو اجتہاد کی لازمی شرائط میں شمار کرتے ہیں۔ نئے علمی انکشافات اور تجربی علوم سے مزّین جدید مسلمان مفکرین کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ پورے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ فکرِ اسلامی کی تشکیل کے لیے آگے بڑھیں۔"(۱۹)

اقبالؔ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے وہ کسی بھی مکتبِ فکر سے دور دور تک کا واسطہ نہیں رکھتا ہے۔ ہم کیونکہ نئے نئے تجربات اور احوال سے فیض یاب ہو رہے ہیں لہٰذا فقۂ اسلامی کی تشکیلِ نو کرنے میں ہمیں بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ہمارے اس طرزِ فکر سے نہ صرف موجودہ عہد کے احوال سے ہم آہنگی پیدا ہوگی بلکہ اس سے مستقبل میں نئی نئی راہیں کھلنے کے امکانات پیدا ہوں گے۔

اقبالؔ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اقبالؔ تاریخ کو علم کا سرچشمہ گردانتے ہیں۔ بلاشبہ تاریخ ہی اُمتوں کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے کرتی ہے اور اقوام اپنی کارگزاری کا صلہ اس دنیا میں ہی دیکھ لیتی ہیں۔ اس طرح علم اور ہدایت نوعِ انسانی کو ہمہ وقت ملتے رہتے ہیں، اقبالؔ نے اسے "تاریخی علم" سے تعبیر کیا ہے جس سے نہ صرف اقوام عبرت حاصل کی جاسکتی ہے بلکہ اس سے لہو بھی گرمایا جاسکتا ہے۔ اقبال کی رائے میں ماٰخذ فقہ میں قران، حدیث، قیاس اور اجماع شامل ہیں۔ ان میں قران کو سب سے پہلے ماٰخذ کا درجہ حاصل ہے جو تا قیامت رہے گا۔ دیگر ماٰخذ کو عقل، فطرت اور تاریخ کے مسلمہ اُصولوں کی روشنی پر جانچنا چاہیے۔ یہاں یہ بات ہماری توجہ کا محور ہونی چاہیے کہ اجتہادی حضرات اپنے اپنے طور پر انفرادی اجتہاد کا سلسلہ جاری رکھیں مگر ایک ریاست کو چلانے کے لیے حکومت کے تمام معاملات اور آئین اور قانون کے مسائل کو انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اجتہاد سے سُلجھانے کی کوشش کریں۔

مندرجہ بالا گفتگو سے ہم بخوبی جان سکتے ہیں کہ اقبالؔ کے پیشِ نظر ایک اجتہادی مکتبِ فکر کا فعال ہونا کس قدر ضروری تھا مگر افسوس کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِس کے نقوش اور بھی مدھم ہوتے جارہے ہیں۔

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ محکومیٔ و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق (۲۰)

فطرت اور تاریخ

فطرت اور تاریخ کو اقبالؔ کے ہاں بہترین معلم کی حیثیت حاصل ہے جو مسلسل ضربت سے دنیا کو نئے زاویوں سے تراشتی ہے اور نئے نئے نقش اُبھارتی ہے۔ برِ صغیر کے مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھتے ہوئے اقبالؔ کو یہ فکر بھی لاحق تھی کہ مسلمان ایک وطن میں رہتے ہوئے عام اقوام کی طرح اپنی شناخت کھونہ دیں اور دیگر اقوام میں ضم نہ ہو جائیں لہٰذا وہ اس جمود کو توڑنے کے لیے انہیں فطرت سے سبق سیکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نسیمِ سحر اس لیے باغ کے لیے شگفتہ اور کیف آفریں ہے کیونکہ یہ حالتِ سفر میں رہتی ہے۔ رومانی شاعر ہونے کے ناطے اقبالؔ فطرت کے نباض تھے اسی لیے اتنے اعتماد سے بدلتی دنیا کے منظر نامے کو اشعار کے قالب میں ڈھالتے چلے گئے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کرمداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے (۲۱)

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و برپیدا (۲۲)

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا (۲۳)

اقبالؔ خون صد ہزار انجم سے سحَر پیدا ہونے کی نوید دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخریب میں تعمیر کے جوہر پوشیدہ ہیں اور فطرت کی تعلیم بھی یہی ہے۔ جس طرح زلزلوں کے بعد وادیوں سے تازہ پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں اسی طرح جب غلام قوموں کا لہو جوش مارتا ہے تو یہ جہاںِ رنگ و بو کانپ اُٹھتا ہے۔ ان کی مسلسل یورش سے حاکمیت کا بُت پاش پاش ہو جاتا ہے اور آزادی کی صبح نور پھوٹتی ہے۔ زمانے کی یہی ڈگر جانی مانی ہے کہ جو آج ہے وہ جو کل نہیں تھا اور جو کل ظہور پذیر ہو گا، آج اس سے بے خبر ہے۔ پائیداری تو صرف تغیر ہی کو حاصل ہے۔ متغیر زمانہ قوموں کو آزمائش کے مختلف مراحل سے گزارتا ہے۔ کبھی حکومت دے کر اور کبھی کسی سے حکومت لے کر۔ عارفین کی آنکھ ان تغیراتِ زمانہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے ہدف پر مرکوز رہتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں اجتماعی سطح پر یہ ہدف نفوسِ ملت کی تطہیر ہے جس کے لیے یہ بزمِ دنیا سجائی گئی ہے۔ اقبالؔ کے ہاں قوموں کے عروج و زوال کو جذباتی، روحانی اور نفسیاتی سطح پر بھی پرکھا گیا

ہے۔ ہماری نظر میں کلامِ اقبالؔ کی قدر و قیمت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم اقبالؔ کو خواب پرست بھی دیکھتے ہیں۔ ایک ایسا خواب پرست جو آنے والے دِنوں میں اہلِ مشرق کو اپنے زمانے کے شعور کی بلند ترین سطح پر فائز دیکھنا چاہتا ہے۔ اقبالؔ کی بصیرت و بصارت اور طرزِ احساس تاریخ کی بدلتی حقیقتوں سے پروان چڑھے لہٰذا وہ تعقل کے راز پانے کی بجائے خود دشعلہ بن کر حیاتِ مستعار کو پھونک دینا چاہتے ہیں اور پھر اس خاکستر سے جہانِ نو کو تعمیر کرنے کی فکر میں محور ہے۔ وہ نطشے، برگساں اور مارکس سے اس لیے بھی متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ یہ فیلسوف تخلیقی اور ادبی جہت کے سالار ہیں نہ کہ استدلالی بحث کے خوگر۔ اقبالؔ کو تاریخ میں برپا ہونے والے واقعات میں خونِ جگر کی نمود نظر آتی ہے جس کی بنیاد یقینِ کامل کی مضبوطی اور ایمان کی پختگی ہے۔ ان کے نزدیک یقین کی یہ دولت قوتِ حیات کو ایک مرکز پر مرکوز کرتی ہے اور دنیا کی تاریخ میں معجزات رونما کرتی ہے۔ اسی قوتِ حیات کو اقبالؔ نے عشق کا نام دیا ہے جو تند و تیز زمانے کی سرکشی کو قابو میں لانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مردِ مومن کی قامت کردار زندگی کو اعلیٰ مقاصد کے تابع بناتی ہے لہٰذا اقبالؔ کے نزدیک تاریخ پر گہرے نقوش اُن ہستیوں نے چھوڑے جو اعلیٰ اقدار کے فروغ کے لیے کمربستہ رہے۔ ان نابغۂ روزگار ہستیوں نے اپنے نہاں خانۂ دماغ میں فکر و خیال کی ایک علیحدہ بستی بسائی ہوئی تھی۔

اقبالؔ کے نزدیک تاریخ میں دو قوتیں بڑی متحرک نظر آتی ہیں۔ ایک تو فطرت ہے جو روپ بدل بدل کر نئے زمانے اور نئے صبح شام طلوع کرتی ہے اور دوسری قوت عشق، جسے ذوقِ پرواز میسر آجائے تو وہ دنیا میں غیر معمولی کارنامے سرانجام دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظ تازہ ہے شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی (۲۴)

اقبالؔ فطرت کو مثال بناتے ہوئے مشکلات کا حل اور مناسب حکمتِ عملی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ اس راز سے بھی پردہ اُٹھاتے ہیں کہ کازارِ حیات میں مختلف مراحل کیسے طے کیے جائیں کہ زندگی کامیاب اور خوش گوار گزرے۔ اُن کا کہنہ ہے کہ نامساعد حالات اور اجنبی ماحول میں انسان کی توانائیاں زائل ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اس صورت میں یہاں وقت صرف کرنا نادانی ہے۔ اس کے برعکس اچھی صحبت میسر آئے تو اپنی اُن صلاحتوں کو بھرپور انداز میں بروئے کار لانا چاہیے جن سے ماحول کی شادابی میں اضافہ ہو۔

گزر جابن کے موجِ سیل کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا (۲۵)

اسلامی تشخص

اقبالؔ کے مطابق اس بدلتی دنیا کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی تشخص کو برقرار رکھا جائے کیونکہ ایمانی اور روحانی اقدار سے بابلد اقوام احترامِ آدمیت اور انسانی وحدت کا کوئی عملی نمونہ پیش کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ سائنس کے جدید انکشافات جامد ادیان سے ٹکراتے رہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ مغرب نے جب ترقی کی راہوں پر قدم رکھا تو انہیں کلیسا سے اپنی راہیں جدا کرنا پڑیں۔ وہ اس حقیقت کو نہ پا سکے کہ دین و دنیا سیاست و کلیسا الگ الگ نہیں ہیں۔ یوں ان دونوں کے مابین بحث و تکرار اور جنگ و جدل کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جس میں بالآخر کلیسا کو شکست ہوئی۔ اقبالؔ کو اس اکھاڑ پچھاڑ سے نفور ہے، تاہم اس صورتِ حال میں انہیں اُمتِ مسلمہ میں بیداری کی لہر نظر آئی۔

دیکھ چکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگر گوں ہوا مغربیوں کا مزاج (۲۶)

روحِ مسلمان میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں (۲۷)

فکرِ اقبالؔ کا اصل جوہر تمنائے انقلاب ہے کیونکہ زندگی کے متعلق زاویۂ نظر بدلنے سے زندگی میں تبدیلی رونما ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ اسلام کا منتہائے نظر زندگی کو کسی ایک صورت میں جامد کرنا نہیں بلکہ اسے خوئے انقلاب کا درس دینا ہے۔ وہ قومیں جو اپنے سامنے زندگی کا لائحہ عمل رکھتی ہیں یا اپنے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی چیلنج رکھتی ہیں، اُنہیں قدیم تہذیبی ڈھانچے تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی جستجو میں لگی رہتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ بدلتی دنیا زندگی کے نئے قالب از خود تلاش کرلیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہوچکی ہے کیونکہ اللہ نے نفسِ ملتِ اسلامیہ میں انقلاب آفرینی کو سمو دیا ہے اور اس کی یاددہانی کا ذمہ بھی لے لیا ہے۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک

کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک (۲۸)

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی اور ۱۹۴۷ء کی صبحِ آزادی کے درمیان صرف ۹۰ سال کا مختصر عرصہ حائل ہے۔ یہ اقبالؔ اور ان جیسے مفکرین ہی کا معجزہ تھا کہ اس دوران ہم نے بے مثل قربانیاں پیش کیں اور خونِ صد ہزار انجم سے پیدا ہونے والی سحر کو دیکھ کر شادماں ہوئے۔ اقبالؔ کو ہمارے قومی شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا مگر یہاں اقبالؔ کی کوششیں تمام نہیں ہوتیں۔ ہم اقبالؔ پرستی میں ستّر سال گزار چکے ہیں، مگر اب وقت آگیا ہے کہ اقبالؔ شناسی کی جانب قدم بڑھائیں۔

آج ہمارے نوجوان اغیار کے فلسفہ و فکر سے مرعوب ہو کر ان کی تائید کر رہے ہیں۔ نئی نسل پرانی نسل سے مایوس ہے اور پرانی نسل نئی نسل سے بیزار ہے۔ معاشرے میں تفاوت عمری یعنی Generation Gap خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ معاشرہ تمیزِ گدا و شاہ سے رہائی نہیں پا رہا۔ فکرِ اقبالؔ کی تعبیر و تشریح کا اس سے شاندار موقع اور کوئی نہیں کیونکہ فکرِ اقبالؔ قدامت اور جدت کا وہ حسین ملاپ ہے جہاں فقر و سلطنت باہم گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ اجتہادی فکر معاشرے میں سماجی میل جول کو وقعت دیتی ہے اور یوں ایک فکری عدالت ہمہ وقت کھُلی رہتی ہے۔ یہی فکرِ اقبالؔ ہے جس کی وضاحت خلیفہ عبدالحکیم نے یوں پیش کی۔

> " زندہ قوموں کو دیکھو کہ کمال جدت پسندی کے ساتھ ساتھ اپنی روایات کے متعلق کس قدر قدامت پرست ہوتی ہیں۔ دوش و امروز کا پیوند نفسِ ملت میں لذت اور قوت پیدا کرتا ہے" (۲۹)

بادۂ صد سالہ در مینائے او مستی پارینہ در صہبائے او (۳۰)

حوالہ جات:

۱۔ فیضؔ، سرِ وادیٔ سینا مشمولہ نسخہ ہائے وفا، لاہور، مکتبہ کارواں، س ن، ص ۴۶۰ تو۔
۲۔ شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۲۲۱۔
۳۔ پنڈت سریندر نرائن، جنگِ عظیم، لکھنؤ، ادبی پریس لاٹوش روڈ، ۱۹۴۳ء، ص ۱۳۔
۴۔ Mujahid Kamran,Einstein and Germany,Lahore,San-Meel Publications,2012,P:183
۵۔ اقبال، کلیات اقبال، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵، ص ۴۶۱۔
۶۔ غالب، دیوان غالب جدید، بھوپال، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۲، ص ۲۵۸۔

۷۔ اقبال، کلیات اقبال، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵، ص ۴۲۰۔

۸۔ ایضاً، ص ۴۳۴۔ ۹۔ ایضاً، ص ۴۳۵۔ ۱۰۔ ایضاً، ص ۱۷۸۔ ۱۱۔ ایضاً، ۳۹۱۔

۱۲۔ علامہ اقبال، علم الاقتصادیات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۲۱۔

۱۳۔ امجد علی بیگ، ڈاکٹر، اقبال اور اقتصادیات، مشمولہ نقوش اقبال نمبر شمارہ ۱۲۱، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۷۷، ص ۳۶۵۔

۱۴۔ اقبال، اقبال تقریریں، تحریریں اور بیانات (مترجم اقبال احمد صدیقی) لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۹، ص ۱۶۱۔

۱۵۔ اقبال، کلیات اقبال، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵، ص ۶۷۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۴۷۔ ۱۷۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔ ۱۸۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔

۱۹۔ محمد یوسف گورایہ، ڈاکٹر، علامہ اقبال اور اصول اجتہاد، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۹۲، ص ۵۷۔

۲۰۔ اقبال، کلیات اقبال، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵، ص ۵۳۴۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۵۱۔ ۲۲۔ ایضاً، ص ۲۹۸۔ ۲۳۔ ایضاً، ص ۴۲۷۔ ۲۴۔ ایضاً، ص ۴۵۴۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۰۴۔ ۲۶۔ ایضاً، ص ۴۲۶۔ ۲۷۔ ایضاً، ص ۴۲۷۔ ۲۸۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔

۲۹۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۸۸، ص ۶۸۸۔۶۸۹۔

۳۰۔ اقبال، رموز بے خودی، (شارح مسعود مفتی۔ زاہد ملک) لاہور، سیونتھ اسکائی پبلی کیشنز، ۲۰۱۹، ص ۱۷۵۔

کتابیات:

۱۔ امجد علی بیگ، ڈاکٹر۔ *اقبال اور اقتصادیات*، مشمولہ *نقوش (اقبال نمبر)*، شمارہ ۱۲۱، لاہور: ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۷۷ء۔

۲۔ اقبال۔ *کلیاتِ اقبال*، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵ء۔

۳۔ اقبال۔ *رموزِ بے خودی*، لاہور: سیونتھ اسکائی پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء۔

۴۔ اقبال، علامہ۔ *اقبال: تقریریں، تحریریں اور بیانات* (مترجم: اقبال احمد صدیقی)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۹ء۔

۵۔ اقبال، علامہ محمد۔ *علمُ الاقتصاد*، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

۶۔ فیض احمد فیض۔ *سرِ وادیِ سینا*، مشمولہ *نسخہ ہائے وفا*، لاہور: مکتبۂ کارواں، س ن۔

۷۔ غالب۔ *دیوانِ غالب جدید*، بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۲ء۔

۸۔ گورایہ، ڈاکٹر محمد یوسف۔ *علامہ اقبال اور اصولِ اجتہاد*، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۹۲ء۔

۹۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر۔ *فکرِ اقبال*، لاہور: نظمِ اقبال، ۱۹۸۸ء۔

۱۰۔ مجاہد کامران۔ *Einstein and Germany*، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

۱۱۔ نرائن، پنڈت سریندر۔ *جنگِ عظیم*، لکھنؤ: ادبی پریس، لاٹوش روڈ، ۱۹۴۳ء۔

۱۲۔ شمیم حنفی۔ *جدیدیت اور نئی شاعری*، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

Bibliography :

1. Allama Iqbal, Iqbal: Taqreeren, Tehreeren aur Bayanaat (Tarjuma: Iqbal Ahmad Siddiqi), Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1999.
2. Allama Muhammad Iqbal, Ilm-ul-Iqtisad, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2004.
3. Dr. Amjad Ali Baig, Iqbal aur Iqtisadiyat, mashmoola Naqoosh (Iqbal Number), Shumara 121, Lahore: Idara-e-Farogh-e-Urdu, 1977.
4. Dr. Khalifa Abdul Hakim, Fikr-e-Iqbal, Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1988.
5. Dr. Muhammad Yousuf Goraya, Allama Iqbal aur Usool-e-Ijtihad, Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1992.
6. Faiz Ahmad Faiz, Sar-e-Wadi-e-Seena, mashmoola Nuskha Haye Wafa, Lahore: Maktaba-e-Karwan, s.n.
7. Mirza Ghalib, Diwan-e-Ghalib, Karachi: Fazli Sons Limited, 1997.
8. Mujahid Kamran, Einstein and Germany, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2012.
9. Pandit Surinder Narain, Jang-e-Azeem, Lucknow: Adabi Press, Latouche Road, 1943.
10. Shameem Hanafi, Jadeediyat aur Nai Shayari, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2008.

☆☆☆☆☆